نظم "صقلیہ" (جزیرہ سسلی): ایک بند کی تشریح

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین

جزیرہ صقلیہ (سسلی) اٹلی کے جنوب میں بحیرہ روم میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۹۸۶۰ مربع میل ہے۔ آٹھویں صدی ق م میں اس پر یونانی قابض تھے۔ دوسری صدی ق م میں اس پر کارتھج کا غلبہ ہوگیا۔ پھر ایک مدت تک یہ جزیرہ سلطنت روم میں شامل رہا۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ خلافت (۶۵۳ء) میں اس پر حملہ کیا۔ ان کا آخری حملہ ۸۲۷ء میں ہوا اور دولت اغالبہ کے فرمانروا زیادۃ اللہ اول کے قاضی القضاۃ اسد بن فرات کی سرکردگی میں انہیں فتح حاصل ہوئی۔ ۹۱۶ء تک یہاں اغالبہ کی حکومت رہی۔ پھر تقریباً تیس برس تک مصر کے فاطمی حکمران اس پر متصرف رہے' اس کے بعد یہ ۹۴۷ء تا ۱۰۳۹ء کلبی خاندان کے زیر حکومت رہا۔ ۱۰۵۲ء میں نارمنوں نے راجر کی سرکردگی میں حملہ کیا۔ چالیس برس تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہا' آخر پورا جزیرہ نارمنوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۲۸۵ء میں یہ شاہ اراگان (سپین) کے زیر تسلط آگیا اور ۱۳۴۲ء میں فرانس کے قبضے میں چلا گیا۔ گویا پورے چار سو سال یہ جزیرہ سیاسی افراتفری کا شکار رہا اور آخر میں اٹلی کا حصہ بن گیا' اور آج تک اسی کا حصہ ہے۔

مسلمان' سسلی میں دو سو برس کے لگ بھگ برسر اقتدار رہے' یہ مدت گو مختصر ہے لیکن اس دوران یہ جزیرہ تہذیب و ثقافت اور علم و فن کا گہوارہ رہا۔ یہاں بڑے بڑے عالم و فاضل پیدا ہوئے جنہوں نے قرآن' حدیث' فقہ' کلام' تصوف' تاریخ' سیرت' زبان' لغت' شعر و ادب اور دوسرے علوم و فنون جیسے طب' جغرافیہ اور سائنس وغیرہ پر بکثرت کتابیں لکھیں(۱)۔

نارمن حکمرانوں نے مسلم اقتدار کی بساط تو لپیٹ دی لیکن وہ مسلمانوں کے تہذیبی اثرات کو اپنی تمام تر مسلم دشمنی کے باوجود مکمل طور پر محو نہ کر سکے۔ صقلیہ کے عوام و خواص حتیٰ کہ

حکمرانوں کے اطوار، عادات، رہن سہن اور فن تعمیر وغیرہ پر مسلم نقوش ایک طویل مدت تک ثبت رہے۔ سسلی کا پہلا نارمن حکمران راجر اول (۱۰۹۱ء-۱۱۰۱ء) گو مسلمانوں کا سخت دشمن تھا، لیکن وہ اپنے احکام یونانی اور لاطینی کے ساتھ عربی میں بھی جاری کرنے پر مجبور تھا۔ یورپ میں کاغذ پر پہلی تحریر اس کی بیوی کا ایک حکم تھا جو بیک وقت عربی اور یونانی میں جاری ہوا۔ راجر دوم (۱۱۰۵ء-۱۱۵۴ء) کا نہ صرف لباس عربی طرز کا تھا بلکہ اس پر عربی زبان کی عبارات کی خطاطی سے تزئین و آرائش بھی کی گئی تھی۔ اس کے عہد میں سکے پر یہ عبارت کندہ تھی:

المعتز باللہ الملک المعظم رجار ثانی

لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ

سنہ ھ

اس کے بعد ولیم اول (۱۱۵۴ء-۱۱۶۶ء) تخت نشین ہوا اور سکے پر یہ عبارت لکھوائی:

الهادی بامر اللہ الملک المعظم (۲)

مشہور اندلسی جغرافیہ دان اور سیاح ابن جبیر (م ۱۲۱۴ء) ۱۱۸۴ء میں سسلی پہنچا۔ وہ اس وقت کے حکمران ولیم دوم کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ عمدہ اخلاق و کردار کا مالک ہے۔ اس کے خدمتگار، باورچی، دربان اور وزراء سب کے سب مسلمان ہیں (۳)۔ اس کا سرکاری نشان الحمدللہ حق حمدہ ہے، اس کے باپ ولیم اول کا الحمدللہ شکراً لا نعمہ (۴)۔

علامہ اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں جب اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد یورپ سے واپس وطن آئے تو راستے میں انھیں جزیرہ "صقلیہ" دکھائی دیا۔ اس نظارے نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا اور ان کے تصور میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے کاروان تہذیب کے تمام مراحل روشن ہو گئے۔ ماضی اور حال کے موازنے سے ان کا دل بھر آیا، کہاں وہ عروج اور کہاں یہ زوال! شدت غم سے ان کی آنکھوں سے جو آنسو گرے، وہ موتی بن کر لفظوں کی صورت میں ڈھل گئے، اور ان موتیوں کی لڑیاں مصرعوں اور شعروں کی شکل میں نظم "صقلیہ" (جزیرہ سسلی) کا عنوان اختیار کر گئیں۔ یہ نظم "بانگ درا" کے حصہ دوم کی آخری نظم ہے۔ یہ نظم چار بندوں اور سترہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا تیسرا بند یوں ہے۔

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر

نظم صقلیہ (جزیرہ سسلی) ایک بند کی تشریح

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر	داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی	ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا (۵)

نظم "صقلیہ" شہر آشوب کی صورت میں ہے۔ اس کے مذکورہ بند میں علامہ اقبال نے عالم اسلام کے سیاسی زوال کے حوالے سے بغداد، دلی، غرناطہ اور صقلیہ ایسے مقامات کی تباہی پر اظہار رنج و غم کرنے والے شعراء کا ذکر کیا ہے جن میں بالترتیب بلبل شیراز یعنی شیخ سعدی شیرازی، نواب مرزا خان داغ، ابن بدروں (؟) اور خود اقبال شامل ہیں۔

مرثیہ سقوط بغداد

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی ۱۱۸۴ء میں شیراز میں پیدا ہوئے، جامعہ نظامیہ بغداد میں تعلیم حاصل کی، ایک مدت تک مختلف دیار و امصار کی سیاحت میں مصروف رہے۔ شیخ سعدی بہت بڑے دانا، حکیم و شاعر اور نثر نگار تھے۔ اپنی تصانیف "گلستان" اور "بوستان" کی بدولت مشرق و مغرب میں شہرت عام پائی اور بقائے دوام سے سرفراز ہوئے۔ غزل کے علاوہ قصیدے اور مرثیے کی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی اور نثر کو ایک نئے لہجے سے آشنا کیا۔

عصر سعدی میں خلافت عباسیہ روبہ زوال تھی، اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں نے مل جل کر خلافت کو نحیف و نزار اور مرکز خلافت بغداد کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ دو سال تک دریائے دجلہ کے طوفانی سیلاب اور دیگر حوادث زمانہ بلائے جان بنے رہے۔ رہی سہی کسر تاتاریوں کی بے پناہ یلغار نے پوری کر دی۔

۱۰ جمادی الثانی ۶۴۰ھ کو آخری عباسی فرمانروا مستعصم باللہ تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ عباسیوں کی شاندار حکومت کے اثرات کو پانچ سو سال تک کسی نہ کسی صورت میں باقی تھے، لیکن عباسی سلطنت کی مرکزیت بتدریج ختم ہو رہی تھی اور انتشار روز بروز بڑھ رہا تھا۔ مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو چکی تھیں جو ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں۔ اس صورت حال سے دشمن فائدہ اٹھانے کے منصوبے بنا رہے تھے، خاص طور پر چنگیز خان کا بیٹا تولی خان اسلامی سلطنت کو تہس نہس کرنے کے لیے بے تاب تھا، لیکن چونکہ بغداد، بہرحال دنیائے

اسلام کا مرکز تھا' اس لیے وہ اس پر حملہ آور ہونے سے ہچکچاتا رہا۔ البتہ ۶۵۴ھ میں اس کی موت کے بعد جب اس کا بیٹا منگو خان تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے حالات ساز گار دیکھ کر اپنے بھائی ہلاکو خان کو بغداد پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

بغداد میں ان دنوں شیعہ۔ سنی مناقشت زوروں پر تھی' بعض امراء نے بھی تاتاریوں سے ملی بھگت کر رکھی تھی۔ اس مخدوش صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہلاکو خان نے ۴ صفر ۶۵۶ھ / ۱۰ فروری ۱۲۵۸ء کو بغداد کا محاصرہ کر لیا جو کئی روز جاری رہا۔ بالآخر مستعصم باللہ نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو تاتاریوں کے حوالے کر دیا۔ ہلاکو خان نے اسے' اس کے بیٹوں اور دیگر افراد خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اہل بغداد نے امان کی امید پر شہر کے دروازے کھول دیے لیکن تاتاریوں نے قتل و غارت کا وہ بازار گرم کیا کہ خدا کی پناہ۔ لاکھوں انسان تہ تیغ ہوئے۔ تاتاریوں نے لوٹ مار کے بعد عمارات کو آگ لگا دی۔

بغداد جو کبھی دنیا کا عظیم ترین اور خوبصورت ترین شہر تھا' تاتاریوں کی تاخت و تاراج کے نتیجے میں کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔ شیخ سعدی شیرازی کے دل پر اس حادثہ فاجعہ کا شدید اثر ہوا' انھوں نے اپنے دلی رنج و غم کے اظہار کے لیے عربی اور فارسی میں مرثیے کہے۔ یہ دونوں مرثیے زور بیان اور جذبہ غم کی شدت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ عربی میں رائیہ مرثیہ طویل تر ہے لیکن فارسی مرثیہ زیادہ مشہور و مقبول ہے۔ اٹھائیس اشعار پر مشتمل اس مرثیے کا عنوان ہے: "در زوال خلافت بنی عباس"(۱)۔

علامہ شبلی نعمانی' شیخ سعدی کے اس مرثیے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "اس وقت تک مرثیہ کا عام انداز یہ تھا کہ اشخاص کا مرثیہ لکھتے تھے' قومی یا ملکی مرثیہ کا مطلق رواج نہ تھا۔ شیخ پہلا شخص ہے جس نے قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا۔ عباسیوں کی سلطنت اب گو برائے نام رہ گئی تھی پھر بھی پانچ سو برس کی اسلامی یادگار تھی اور بغداد تمام اسلامی دنیا کا مرکز تھا' اس لیے اس کا مٹنا' قوم کا مٹنا تھا۔ شیخ نے اس بنا پر خلیفہ اور بغداد اور سلطنت کا مرثیہ لکھا' اور جس طرح سے لکھا' اس کا اندازہ ان اشعار سے خود کر سکتے ہو۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں بر زوال ملک مستعصم امیرالمومنیں

اے محمد! گر قیامت سربروں آری ز خاک سربروں آرو قیامت درمیان خلق بیں

نظم صقلیہ (جزیرہ سسلی) ایک بند کی تشریح

نازنان حرم را موج خون بے دریغ   زاستاں بگذشت و مارا خون دل از آستیں
دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکت بیت الحرام   قیصران روم سر بر خاک وخاقاں بر زمیں
خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریختہ   ہم برآں جائے کہ سلطاناں نہاد ندے جبیں
باش تا فردا بہ بینی روز داد و رستخیز   کز لحد با زخم خون آلودہ برخیزد دفیں (۷)

مرثیے کے آخری چند اشعار ابو بکر بن سعد زنگی کی "مدح" میں ہیں جن کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی نے شعرالعجم میں لکھا ہے:

"ابو بکر بن سعد نے ہلاکو خان کی اطاعت قبول کر لی تھی، یہاں تک کہ جب ہلاکو خان نے بغداد پر چڑھائی کی تو ابو بکر نے اپنے بیٹے سعد کو فوج دے کر اعانت کے لیے بھیجا، اور جب بغداد تاراج ہوا تو ابو بکر نے مبارکباد کے لیے سفارت بھیجی۔ بااین ہمہ شیخ نے بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا اور اس قدر پراثر لکھا کہ لوگوں کے دل دہل گئے۔ یہ مرثیہ درحقیقت ابوبکر بن سعد زنگی کی ہجو تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور بربادی میں ہلاکو خان کا ساتھ دیا۔ شیخ نے اس مرثیے میں ابوبکر کا بھی ذکر کیا اور ہجو ملیح کے طور پر "مدح" کے پیرائے میں چوٹ کی"(۸)۔

شیخ سعدی نے زوال بغداد پر جو عربی قصیدہ لکھا ہے، اس کا عنوان ہے "فی مرثیۃ امیر المومنین المستعصم باللہ و ذکر واقعہ بغداد۔" اس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ یہ اشعار مولانا حالی نے منتخب کیے ہیں اور ان کا ترجمہ بھی انہی کے قلم سے ہے۔

حَبَسْتُ بِجَفْنَيَّ الْمَدَامِعَ لَا تَجْرِي
فَلَمَّا طَغَى الْمَاءُ اسْتَطَالَ عَلَى السَّكْرِ

(ترجمہ) میں نے اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو روکا تھا، بہنے نہ پائیں، پر جب پانی نے طغیانی کی تو اس بند کو توڑ ڈالا۔

نَسِيمُ صَبَا بَغْدَادَ بَعْدَ خَرَابِهَا
تَمَنَّيْتُ لَوْ كَانَتْ تَمُرُّ عَلَى قَبْرِي

کاش ایسا ہوتا کہ بغداد کی تباہی کے بعد اس کی ہوا کا جھونکا میری قبر پر گزرتا

لِأَنَّ هَلَاكَ النَّفْسِ عِنْدَ أُولِي النُّهَى
أَحَبُّ لَهُمْ مِنْ عَيْشِ مُنْقَبِضِ الصَّدْرِ

کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک مرجانا تنگ دل جینے سے بہتر ہے۔

میں نے طبیب کو جبکہ اس نے علاج کے لیے

زَجَرْتُ طَبِيباً جَسَّ نَبْضِي مُدَاوِيًا
إلَيْكَ. فَمَا شَكْوَايَ مِنْ مَرَضٍ تَبْرِي

میری نبض کو چھوا، جھڑک دیا کہ جا اپنا کام کر، مجھ کو ایسے مرض کی شکایت نہیں جو اچھا ہو سکے۔

لَزِمْتُ اصْطِبَاراً حَيْثُ كُنْتُ مُفَارِقاً
وَهٰذَا فِرَاقٌ لَا يُعَالَجُ بِالصَّبْرِ

میں نے ہمیشہ احباب کی جدائی میں صبر اختیار کیا ہے، مگر یہ ایسی جدائی ہے جس کا علاج صبر سے ممکن نہیں۔

وَلَا تَسْأَلَنْ عَمَّا جَرَىٰ يَوْمَ حَصْرِهِمْ
وَذٰلِكَ مِمَّا لَيْسَ يَدْخُلُ فِي الْحَصْرِ

نہ پوچھو جو حال بنی عباس کی قید کے دن گزرا، یہ وہ حال ہے جو قید بیان میں نہیں آ سکتا۔

أُدِيرَتْ كُؤُوسُ الْمَوْتِ حَتّٰى كَأَنَّهُ
رُؤُوسُ الْأُسَارَىٰ تَرْجِحَنَّ مِنَ السُّكْرِ

شراب مرگ کے جام گردش میں لائے گئے، یہاں تک کہ قیدی کشتوں کے سر (تڑپتے ہوئے) ایسے معلوم ہوتے تھے گویا نشے میں جنبش کر رہے ہیں۔

بَكَتْ جُدُرُ الْمُسْتَنْصِرِيَّةِ نُدْبَةً
عَلَى الْعُلَمَاءِ الرَّاسِخِينَ ذَوِي الْحِجْرِ

علمائے راسخین پر جو کہ اصحاب عقل و دانش تھے، مدرسہ مستنصریہ کی دیواریں زار و زار رو رہی ہیں۔

مَحَابِرُ تَبْكِي بَعْدَهُمْ بِسَوَادِهَا
وَبَعْضُ قُلُوبِ النَّاسِ أَمْلَكُ مِنْ حِبْرِ

ان کے بعد دواتیں اپنی سیاہی کے آنسوؤں سے روتی ہیں۔ مگر بعض لوگوں کے دل دوات سے زیادہ سیاہ ہیں۔

نَوَائِبُ دَهْرٍ لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَهَا
وَلَمْ أَرَ عُدْوَانَ السَّفِيهِ عَلَى الْحِبْرِ

یہ زمانہ کے سخت حادثے ہیں۔ کاش میں ان سے پہلے مر جاتا اور جاہلوں کا ظلم دانشمندوں پر نہ دیکھتا! (۹)

شہر آشوب دہلی

نواب مرزا خان داغ ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش قلعہ معلی دہلی میں ہوئی جہاں شعر و شاعری کے خوب چرچے تھے۔ مرزا داغ نے شیخ محمد ابراہیم ذوق کی شاگردی اختیار

نظم صقلیہ (جزیرہ سسلی) ایک بند کی تشریح

کی۔ استاد کی توجہ، فطری مناسبت اور قلعے کے ماحول کے زیر اثر ان کے جوہر خوب چمکے۔ دلی اجڑی تو رام پور چلے گئے، اور پھر حیدر آباد دکن کا رخ کیا۔ وہیں ۱۹۰۵ء میں فوت ہوئے۔

معاملات عشق کی ترجمانی میں مہارت، فکر و تخیل کی بلند پروازی، زبان کا چٹخارہ، بیان کی شوخی اور بانکپن ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ علامہ اقبال جنہیں آغاز شعرگوئی میں مرزا داغ سے اصلاح لینے کا شرف حاصل تھا نہ صرف شاگردی داغ عنداں پر فخر کرتے تھے(۱۰) بلکہ مرزا داغ کی وفات پر انہوں نے ایک زور دار مرثیہ بھی لکھا جس میں انہیں جہان آباد کا آخری شاعر قرار دیا(۱۱)۔ اس دور میں امیر، جلال اور تسلیم ایسے بلند پایہ اساتذۂ فن بھی موجود تھے، لیکن حق یہ ہے کہ جو شہرت اور مقبولیت مرزا داغ کو نصیب ہوئی، وہ ان کے کسی معاصر کو حاصل نہ ہو سکی۔ اپنی زبان دانی کی وجہ سے فصیح الملک اور اپنی شاعرانہ خوبیوں کی بنا پر بلبل ہند کے القاب سے ملقب ہوئے اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے شاگردوں کی کثیر تعداد کی بدولت "جہاں استاد" کے محترم نام سے مشہور ہوئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں انگریزوں کے غلبے نے مغل سلطنت کے مرکز دہلی پر جو قیامت ڈھائی، اس کے تذکرے معاصر شعر و ادب میں بکثرت ملتے ہیں جن کو پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دہلی ایک طویل مدت تک ہندوستان کی سیاسی، علمی اور تہذیبی زندگی کا مرکز رہی تھی۔ مغلوں کے دور زوال میں صوبوں کی خود مختاری، سکھوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کا نشانہ بننے کے باوجود اس کی رونق قائم تھی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اس کی مرکزی حیثیت اور تہذیبی تفوق کو فنا کر دیا۔ ہزاروں مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا، حریت پسند علماء کو پھانسی دی گئی، خواتین کی عزت و عصمت کو داغدار کیا گیا، جاگیریں اور اوقاف ضبط کر لیے گئے، علم و فن کے مراکز تباہ کر دیے گئے، بارونق بازار اجاڑ دیے گئے، عظیم الشان عمارتیں زمیں بوس کر دی گئیں، گنجان آباد دہلی کو کھنڈر بنا کر رکھ دیا گیا۔ آغاز سے اس وقت تک یہ شہر کئی نشیب و فراز سے دوچار ہوا ہو گا، لیکن ۱۸۵۷ء میں اسے ہمہ گیر تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قسم کا دلدوز نظارہ چشم فلک نے شاید کبھی نہ دیکھا ہو گا۔

دہلی کے اس عبرت ناک انقلاب کے زیر اثر جن شعراء نے خون کے آنسو بہائے اور شہر آشوب لکھے، ان میں نواب مرزا خان داغ کا نام نمایاں ہے(۱۲)۔ ان کا شہر آشوب بائیس بندوں پر مشتمل ہے اور مسدس کی ہیئت میں ہے۔ اس شہر آشوب کا پہلا اور آخری بند حسب ذیل

ہے۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلی
جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دلی مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

کہاں تک آہ لکھوں اس کا حال بربادی کہاں تک آہ کہوں آسماں کی جلادی
کسی کو قید محن سے نہیں ہے آزادی کہ داغ داغ ہے دل' ہر کوئی ہے فریادی
الٰہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر اسے حسب مراد دیکھیں ہم (۱۳)

اس کے علاوہ داغ کی ایک غزل میں بھی دہلی کی بربادی پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ مرثیے کی طرح یہ غزل بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

یوں مٹا دہلی ہے' جیسے کہ نشان دہلی
تھا مرا نام و نشاں' نام و نشان دہلی
آسماں پر سے بھی نوحے کی صدا آتی ہے
کیا فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوان دہلی (۱۴)

داغ کا یہ شہر آشوب اور غزل نما مرثیہ بعد کے شعراء کے لیے لائق رشک اور قابل تقلید بن گیا۔

مرثیہ زوال بنو افطس

اقبال نے لکھا ہے کہ دولت غرناطہ کی بربادی پر ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی تھی' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ ابن بدروں نے نہیں' ابن عبدوں نے کہا تھا۔ ابن عبدوں کا اصل نام ابو عبداللہ عبدالمجید ابن عبدوں الفہری ہے۔ وہ یابرہ (Evora) میں پیدا ہوا۔ اس کی شاعرانہ استعداد اور ذہانت کی وجہ سے بنو افطس کی ایک نامور شخصیت ابو حفص عمر بن محمد المتوکل والی یابرہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ المتوکل اس کے کلام کا شیدائی تھا' جب وہ بطلیوس (Badajoz) کا امیر بن گیا تو اس نے ابن عبدوں کو اپنا کاتب یعنی سیکرٹری مقرر کر دیا۔ ۴۸۵ھ/

نظم صقلیہ (جزیرہ سسلی) ایک بند کی تشریح

۱۰۹۲ء میں جب بنو افطس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو ابن عبدون نے مرابطین کی ملازمت اختیار کرلی' اور وہاں بھی کاتب کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا رہا۔ ابن عبدون ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء میں یابرہ میں فوت ہوا(۱۵)۔

ابن عبدون کا مربی المتوکل بنو افطس کا آخری حکمران تھا۔ ہسپانوی عربوں کے اس چھوٹے سے خاندان نے طوائف الملوکی کے دور میں اندلس کے جزیرہ نمائے آئیبریا کے مغربی حصے میں ایک وسیع علاقے پر حکمرانی کی جس کا دارالحکومت بطلیوس تھا۔ المتوکل کے زمانے میں اس خطے کے مسلمانوں کی حالت سخت ناگفتہ بہ تھی۔ الفانسو ششم کی یلغار شروع ہو چکی تھی' اس سے محفوظ رہنے کے لیے جب اندلس کے حکمرانوں نے مل کر المرابطین کو دعوت دی تو المتوکل بھی ان کے ساتھ شامل تھا' لیکن بعد میں اس نے المرابطین کے غلبے کو روکنے کے لیے الفانسو سے مدد طلب کی' مگر اسی دوران المرابطی سپہ سالار سیر بن ابی بکر نے بطلیوس کو سر کر لیا۔ المتوکل اور اس کے دو بیٹے اسیر ہوئے جنہیں بعد میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔(۱۶)

اپنے مربی کے اس حشر اور مسلسل جنگوں کی وجہ سے بطلیوس کے زوال یا بنو افطس کے ادبار نے ابن عبدون کو شدید متاثر کیا۔ اس نے اپنے دلی تاثرات کے اظہار کے لیے ایک زور دار مرثیے کو ذریعہ بنایا جس کا عنوان "البسامتہ الدہر" (زمانے کی بہت بڑی مسکراہٹ) ہے۔ یہ قصیدہ اپنے فنی محاسن کی بدولت عربی کے اہم اور مقبول قصائد میں شمار ہوتا ہے۔ ابن عبدون نے بہت سی نظمیں لکھیں' لیکن اس کی لازوال شہرت کا دارومدار اکثر و بیشتر اس قصیدے پر ہے۔ اس کے صوتی زیر و بم' الفاظ کی موزونیت' سلاست زبان' جوش بیان اور سوز و گداز نے اسے شاعری کا شاہکار بنا دیا ہے۔ البستانی نے اس کے باون (۵۲) اشعار درج کیے ہیں(۱۷)۔ پہلا شعر یوں ہے۔

الدھر یفجع بعد العین بالاثر   فما البکاء علی الاشباح والصور

(آنکھ کے بعد زمانہ بھی عہد رفتہ کے نشانات پر گریہ کناں ہے۔ اب تو ہیولوں اور تصویروں پر ہی رونا رہ گیا ہے)

آخری شعر یہ ہے۔

یرجو عسی ولہ فی اختماطع   والدھر ذو عقب شتی و ذو غیر

(اسے امید ہے' اور یہ بھی کہ اس کی امید جلد پوری ہو گی کیونکہ زمانہ تغیر پذیر ہے اور اس

کے تغیرات گوناگوں ہیں)

قصیدے کے فنی حسن اور تاثیر کے ساتھ ساتھ اس کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ اس میں قدیم تاریخی واقعات کی طرف بکثرت اشارے کیے گئے تھے جن کو سمجھنا آسان نہیں تھا' اس لیے اس کی مختلف شرحیں لکھی گئیں جن میں عمادالدین الاثیر کی تصنیف کردہ شرح بھی شامل ہے۔ لیکن ابن عبدوں کے قصیدے کی سب سے زیادہ مشہور شرح وہ ہے جو عبدالملک بن عبد اللہ الحضرمی نے قلمبند کی۔ عبدالملک بن عبداللہ تاریخ میں ابن بدروں کے نام سے مشہور ہے۔ایک علمی و ادبی محفل میں اس سے قصیدے کے مشکل مقامات یعنی تاریخی تلمیحوں کے حل کی فرمائش کی گئی کیونکہ وہ نہایت بلند پایہ ادیب و خطیب تھا اور شعر و ادب کی باریکیوں سے گہری واقفیت رکھتا تھا۔ ابن بدروں کے حالات زندگی عام طور پر معلوم نہیں ہیں' البتہ کہا جاتا ہے کہ شلب (Silves) میں پیدا ہوا اور ۶۰۸ھ/۱۲۱۱ء تک زندہ تھا۔ اس نے "بسامتہ الدہر" کی جو شرح لکھی' اس کا نام "کمامتہ الزہر و صدفتہ الدرر فی شرح بسامتہ الدہر" (پھولوں کا گچھا اور موتیوں کا صدف جو بسامتہ الدہر کی شرح ہے) رکھا۔ یہ شرح قصیدے کی تلمیحات کی مکمل اور مفصل توضیحات پر مشتمل ہے اور اس کو مشہور مستشرق ڈوزی (Dozi) نے اصل قصیدے کے ساتھ ۱۸۴۶ء میں شائع کیا۔ اس سے قبل ہوگ ولی (Hoogvilet) اسے لیڈن سے ۱۸۳۹ء میں شائع کر چکا تھا۔

اس ضمن میں ایک بات اور محل غور ہے کہ ابن عبدوں کے قصیدے یا مرثیے کا موضوع بنی افطس کا زوال یا بطلیوس کی تباہی ہے' جبکہ اقبال نے اس مرثیے کو زوال غرناطہ سے منسوب کیا ہے۔ لطف یہ کہ نہ تو تاریخ سے اور نہ مرثیہ مذکور سے غرناطہ کی اور بطلیوس کی تباہی میں کوئی ربط و تعلق معلوم ہوتا ہے۔

میں یہ مضمون مکمل کر چکا تھا کہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کی محققانہ تصنیف "مرثیہ صقلیہ پر ایک نظر" منصہ شہود پر آگئی۔ انہوں نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ ابن عبدوں کے مرثیے کا غرناطہ کے سقوط سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مرثیہ اس حادثے سے صدیوں قبل کہا گیا تھا' اور اس کا موضوع دراصل بنی افطس کی دولت بطلیوس کی تباہی سے تھا۔ سقوط غرناطہ (۲ ربیع الاول ۸۹۷ھ /۲ جنوری ۱۴۹۲ء) کے بعد عربی میں جو مرثیے کہے گئے' ان میں سے ایک غرناطہ کے مشہور شاعرو عالم ابو عبداللہ محمد بن عبد اللہ العربی العقیلی نے غرناطہ کے آخری اور معزول شدہ حکمران ابو عبداللہ کے کہنے پر ایک خط کے شروع میں لکھا تھا جو اس نے سلطان فاس کے نام تحریر کیا تھا۔

نظم صقلیہ (جزیرہ سسلی) ایک بند کی تشریح

یہ میمیہ قصیدہ امام بوصیریؒ کے شہرۂ آفاق "قصیدہ بردہ" کی زمین میں ہے۔ غالباً یہ غرناطہ کا پہلا مرثیہ ہے جو کسی غرناطی شاعر نے کہا۔ علاوہ ازیں ایک مرثیہ وہ ہے جو شیخ ابو العباس احمد بن محمد بن یوسف الدقون الصنہاجی کا تصنیف کردہ ہے۔ چھیاسی (۸۶) اشعار پر مشتمل اس لامیہ قصیدے کا نام الموعظتہ الغراء باخذ الحمراء (قصر حمراء پر قبضے میں روشن نصیحت) ہے۔

دوسرا مرثیہ کسی نامعلوم شاعر کا ہے اور سقوط غرناطہ کے بعد کی پردرد اور عبرتناک تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ مرثیہ دراصل عثمانی حکمران سلطان بایزید سے مسلمانان اندلس کی فریاد ہے۔ اس سلسلے کا ایک اور منظومہ وہ ہے جس کو اندلس کے ادیب اور شاعر ابوالبقاء صالح بن شریف الرندی الاندلسی نے لکھا۔ اس قصیدے پر ابن عبدوں کے رائیہ قصیدے کے اثرات نمایاں ہیں۔ ابوالبقاء کا یہ نونیہ قصیدہ اس قدر مقبول ہوا کہ بعد کے لوگوں نے نہ صرف اس کا تتبع کرنے کی کوشش کی بلکہ بعض لوگوں نے اس میں الحاقی شعر بھی شامل کر دیے۔

○

حواشی

۱۔ کچھ کتابوں کا ذکر ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے "یورپ پر اسلام کے اثرات" میں کیا ہے۔ دیکھیے صفحات ۲۷۹-۲۸۸

۲۔ ایضاً' ص ۱۵۱

۳۔ سفرنامہ ابن جبیر' ص ۲۸۱

۴۔ ایضاً' ص ۲۸۲

۵۔ کلیات اقبال' اردو' ص ۱۳۴

۶۔ مکمل متن کے لیے ملاحظہ کیجیے متن کامل دیوان شیخ اجل سعدی شیرازی' ص ۷۵۴-۷۵۵

۷۔ شعر العجم' ج ۲ ص ۶۹۔ دیوان سعدی اور شعر العجم میں منقول اشعار میں کہیں کہیں لفظی تغیرات ہیں۔

۸۔ ایضاً ص ۶۳

۹۔ حیات سعدی' ص ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ مکمل قصیدے کے لیے دیکھیے متن کامل دیوان شیخ اجل سعدی شیرازی' ص ۷۵۶-۷۶۰۔ قیاس ہے کہ اقبال نے جب شیراز کے بلبل کی بغداد پر نالہ کشی کا ذکر کیا تو ان کے پیش نظر سعدی کا صرف فارسی مرثیہ نہیں' بلکہ دونوں مرثیے تھے۔

۱۰۔ باقیات اقبال' ص ۳۸۶

۱۱۔ کلیات اقبال' اردو' ص ۸۹

۱۲۔ رئیس احمد جعفری نے "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" کے باب ۴۹ میں "اشک و آہ" کے عنوان سے کئی نظمیں اور غزلیں درج کی ہیں جو دراصل مرزا غالب کے شاگرد منشی تفضل حسین کوکب کے مرتبہ مجموعے "فغان دہلی" مطبوعہ ۱۸۶۳ء سے ماخوذ ہیں۔

۱۳۔ اس منظومہ کے مختلف انتخاب سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک "بہار داغ" (ص ۱۴۴- ۱۴۷) میں شامل ہے' اور دوسرا "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" کے باب ۴۹ میں۔

۱۴۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد' ص ۹۸۸-۹۸۹

۱۵۔ اردو دائرہ' ج ا' ص ۵۹۷- ۵۹۸' البستانی' ج ا' ص ۵۹۴

۱۶۔ اردو دائرہ' ج ا ص ۹۲۵-۹۲۷

۱۷۔ البستانی' ج ا' ص ۵۹۳-۵۹۴

۱۸- اردو دائرہ' ج '۱' ص ۵۹۸

کتابیات

۱- اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۱' لاہور' دانشگاہ پنجاب

۲- باقیات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی' لاہور' آئینہ ادب' ۱۹۷۸ء

۳- بہادر داغ' انتخاب کلام داغ مرتبہ سید نذیر نیازی' لاہور' کتاب خانہ پنجاب' ۱۹۴۰ء

۴- بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد' سید رئیس احمد جعفری ندوی' لاہور' کتاب منزل' اکتوبر ۱۹۴۹ء

۵- حیات سعدی' الطاف حسین حالی' لاہور' اللہ والے کی قومی دکان' س ن

۶- دائرۃ المعارف' ج ۱' بطرس ابستانی' بیروت' دارالمعرفت' س ن

۷- سفرنامہ ابن جبیر' مترجم حافظ احمد علی خان شوق امروہوی' مرتب شبیر حسین قریشی' کراچی' نفیس اکیڈمی' مئی ۱۹۶۹ء

۸- شعرالعجم' ج ۲' مولانا شبلی نعمانی' لاہور' کتب خانہ انجمن حمایت اسلام' س ن

۹- کلیات اقبال' اردو' لاہور' شیخ غلام علی اینڈ سنز' ۱۹۸۲ء

۱۰- متن کامل دیوان شیخ اجل سعدی شیرازی' گلستان و بوستان و مجالس با مقابلہ مجدد بکوشش مظاہر مصفا' تہران' کانون معرفت' خرداد ماہ ۱۳۴۰ھ ش

۱۱- مرثیہ صقلیہ پر ایک نظر' ڈاکٹر ظہور احمد اظہر لاہور' بزم اقبال' ۱۹۹۲ء

○